رمیش نے کہا۔ ''تو منہ دھوڈالو۔ برف رکھی ہوئی ہے' پانچ بازیاں کھیلے بغیر نہیں سونے دوں گا۔''

رمیش بابو کو یقین ہو رہا تھا کہ آج میرا نیر اقبال اوج پر ہے۔ نہیں تو رما کو متواتر تین مات دینا آسان نہ تھا' مگر جب چوتھی ہار گئے تو یقین جاتا رہا۔ اندیشہ ہوا کہ کہیں متواتر ہارتا جاؤں۔ بولے اب تو سونا چاہیے۔

''کیوں پانچ بازیاں پوری نہ کیجیے گا؟''

''کیا فائدہ کل دفتر بھی تو جانا ہے۔''

رما نے زیادہ اصرار نہ کیا۔ دونوں آدمی سو گئے۔

رمایوں بھی آٹھ بجے سے پہلے نہ اٹھتا تھا۔ پھر آج تو تین بجے سویا تھا۔

آج تو اسے دس بجے تک سونے کا حق تھا' مگر رمیش بابو حسب معمول پانچ بجے اٹھے' نہایا' سندھیا کو گھومنے گئے اور آٹھ بجے لوٹ آئے۔ رما اس وقت تک سوتا ہی رہا۔ آخر جب ساڑھے نو بج گئے تو انہوں نے اسے جگایا۔

رما نے بگڑ کر کہا۔ ''ناحق جگایا۔ کیسے مزے کی نیند آ رہی تھی۔''

''اجی وہ عرضی دینی ہے تم کو یا نہیں؟''

''آپ دے دیجیے گا۔''

''اور جو کہیں صاحب نے بلایا تو میں ہی چلا جاؤں گا؟''

''اونہہ' جو چاہے کیجیے گا' میں تو سوتا ہوں۔''

رما پھر لیٹ گیا۔ رمیش نے کھانا کھایا۔ کپڑے پہنے اور دفتر چلنے کو تیار ہوئے۔ اس وقت رما بک بک کر اٹھا اور بولا۔ ''میں بھی چلوں گا۔''

''ارے منہ تو دھولو۔ بھلے آدمی۔''

''آپ تو چلے جا رہے ہیں۔''

''نہیں نہیں پندرہ بیس منٹ تک رک سکتا ہوں۔ تیار ہو جاؤ۔''

رما نے ایک منٹ میں منہ دھویا۔ پانچ منٹ میں کھانا کھایا اور چٹ پٹ رمیش کے ساتھ دفتر چلا۔

راستے میں رمیش نے مسکرا کر کہا۔ ''گھر کیا بہانہ کرو گے۔ کچھ سوچ رکھا ہے۔''

''کہہ دوں گا رمیش بابو نے آنے نہیں دیا۔''

''مجھے گالیاں دلواؤ گے اور کیا۔''

''مجھے عرضی لے کر صاحب کے پاس تو نہ جانا پڑے گا۔''

''اور کیا تم سمجھتے ہو گھر بیٹھے جگہ مل جائے گی؟ مہینوں دوڑنا پڑے گا۔''

''تو میں ایسی نوکری سے باز آیا۔ مجھے تو عرضی لے کر جاتے شرم آتی ہے۔ پہلے میں کلرکی کو ذلیل سمجھتا تھا۔ مگر وہی میرے سر پر پڑی۔''

''اجی پہلے سب یوں ہی گھبراتے ہیں۔ جب میں نوکر ہوا تو تمہاری عمر تھی۔ جس دن میری پیشی ہونے والی تھی۔ میں ایسا گھبرایا ہوا تھا' جیسے پھانسی پانے جا رہا ہوں۔''

''آپ کو تو بیس بائیس سال نوکری کرتے ہوئے ہوں گی۔''

''پورے پچیس سال ہو گئے' صاحب بیس سال تو بیوی کے انتقال کو ہو گئے۔''

''آپ نے دوسری شادی کیوں نہیں کی' تب تو آپ کی عمر پچاس سے زیادہ نہ

ہوگی۔''

رمیش نے حسرتناک تبسم کے ساتھ کہا۔''محلوں کا سکھ بھوگنے کے بعد جھونپڑا کسے اچھا لگتا ہے بھائی۔محبت سے روح کو دائمی سکون ہو جاتا ہے۔تم میری حالت سے واقف ہو۔اب تو بوڑھا ہوا لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں۔اس فرصت نصیب زندگی میں کبھی میری آنکھوں نے کسی حسینہ کی طرف نگاہ نہیں ڈالی۔کئی بار شادی کے لیے لوگوں نے گھیرا بھی لیکن کبھی خواہش ہی نہ ہوئی۔اس محبت کی شیریں یاد گاروں میں میرے لیے مسرت کے سارے سامان موجود ہیں۔''

یوں باتیں کرتے ہوئے دونوں آدمی دفتر پہنچ گئے۔

(10)

رما دفتر سے گھر پہنچا تو چار بج گئے تھے۔وہ دفتر ہی میں تھا کہ آسمان پر بادل گھر آئے۔پانی آیا ہی چاہتا تھا'پر رما کو گھر پہنچنے کی ایسی جلدی تھی کہ وہاں رک نہ سکا۔ احاطہ کے باہر بھی نکلنے نہ پایا تھا کہ زور کی بارش ہونے لگی۔اساڑھ کا پہلا پانی تھا۔ ایک لمحہ میں وہ لت پت ہو گیا۔پھر بھی وہ کہیں ٹھہرا نہیں۔کامیابی کی خوشخبری کی مسرت میں اس ڈونگرے کی کیا پروا کر سکتا تھا۔اس نے دل میں حساب لگا لیا تھا کہ کتنی ماہوار بچت ہو جانے سے وہ جالپا کے لیے جلد سے جلد چندن ہار بنوا سکے گا۔اگر پچاس ساٹھ روپے مہینہ بھی بچ جائیں تو پانچ سال میں جالپا زیوروں سے لد جائے گی۔گھر پہنچ کر اس نے کپڑے بھی نہ اتارے۔لت پت جالپا کے کمرے میں پہنچ گیا۔

جالپا نے پوچھا۔''یہ بھیگ کہاں گئے اور رات کہاں غائب تھے؟''

رما ناتھ نے کپڑے اتارتے ہوئے کہا۔ ''نوکری کی فکر میں پڑا ہوا تھا۔ اس وقت دفتر سے چلا آتا ہوں۔ مجھے ایک جگہ مل گئی ہے۔''

جالپا نے کھل کر پوچھا۔ ''سچ! کتنے کی جگہ ہے؟''

رما کو صحیح تعداد بتانے میں تامل ہوا۔ تیس کی نوکری بتلانا کسر شان تھی۔ بولا ''ابھی تو چالیس ملیں گے مگر ترقی جلد ہوگی۔ جگہ آمدنی کی ہے۔''

جالپا نے کسی بڑے عہدے کی امید کر رکھی تھی۔ بولی۔ ''چالیس میں کیا ہوگا؟ بھلا ساٹھ ستر تو ہوتے۔''

رما ''مل تو سکتی تھی سو روپیہ کی بھی۔ مگر یہاں رعب ہے اور بالائی آمدنی کی گنجائش بھی کافی ہے۔''

جالپا نے سادگی سے پوچھا۔ ''تو تم رشوت لوگے، غریبوں کا گلا کاٹوگے؟''

رما نے ہنس کر کہا۔ ''نہیں جی! وہ جگہ ایسی نہیں ہے کہ غریبوں کا گلا کاٹنا پڑے بڑے بڑے مہاجنوں سے سابقہ ہوگا اور وہ خوشی سے دیں گے۔''

جالپا کو اطمینان ہوگیا۔ بولی۔ ''تب ٹھیک ہے غریبوں کا کام یوں ہی کر دینا۔''

''ہاں ایسا تو کروں گا ہی!''

''جا کر اماں جی سے تو کہہ آؤ۔ مجھے تو سب سے بڑی خوشی یہی ہے کہ اب معلوم ہوگا۔ یہاں میں بھی کچھ ہوں۔''

''ہاں جاتا ہوں۔ مگر ان سے تو میں تیس ہی بتلاؤں گا۔''

جالپا خوش ہو کر بولی۔ ''اور کیا؟ اور اوپر کی آمدنی کا تو ذکر کرنا فضول ہے۔''

-------------اختتام ۳۳۶---------

غبن صفحہ نمبر 337 سے-----------از شہزاد رضا

اتنے میں ڈاکیے نے پکارا۔ رما نے دروازے پر جا کر دیکھا تو ان کے نام کا ایک پارسل تھا۔

منشی دین دیال نے بھیجا تھا۔ لے کر خوش خوش گھر میں آئے اور چٹ پٹ قینچی نکال کر پارسل کھولا۔ اس میں ایک چھوٹی سی ڈبیا میں ایک چندن ہار رکھا ہوا تھا۔ رما نے خوش ہو کر کہا۔ "یہ تو اچھا شگون ہے۔"

جالپا نے کچھ رنجیدہ ہو کر کہا۔ "میری بلا سے! میں ان کی عنایت کے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہوں۔ آج اتنے دنوں کے بعد انہیں یہ خیال آیا ہے، ان کی چیز انہیں مبارک ہو۔ میں کسی کا احسان لینا نہیں چاہتی۔ تم خیریت سے رہو گے تو مجھے بہت زیور ملیں گے۔"

رما نے تسکین دے کہا۔ "میرے رائے تو یہ ہے کہ اس وقت ہار رکھ لو۔ سوچو انہیں کتنا رنج ہوگا۔ اگر رخصتی کے وقت نہ دیا تو اچھا ہی ہوا، ورنہ یہ بھی غائب ہو جاتا۔"

"میں اسے لوں گی نہیں، یہ طے ہے!"

"آخر کیوں؟"

جالپا نے حسرتناک لہجہ میں کہا۔ "اس لیے کہ اماں نے اسے خوشی سے نہیں دیا ہوگا۔ بہت ممکن ہے کہ اسے بھیجتے وقت وہ روئی ہوں اور اس میں تو کوئی شک نہیں

کہ اسے واپس پا کر انہیں سچی خوشی ہوگی۔ دینے والے کا دل دیکھا جاتا ہے، خوشی سے اگر وہ مجھے ایک چھلا بھی دیں تو دونوں ہاتھ بڑھا کر لے لوں۔ جب دل پر جبر کر کے دنیا کی لاج سے دیا تو کیا دیا۔ میں کسی کی خیرات نہ لوں گی، چاہے وہ اپنی اماں ہی کیوں نہ ہو۔''

جالپا کو ماں کی طرف سے اتنا بدظن دیکھ کر رما اور کچھ نہ کہہ سکا۔ بدگمانی، دلیل اور ثبوت کی پروا نہیں کرتی۔ اس نے ہار اٹھا لیا اور بولا۔ ''ذرا لوگوں کو تو دکھا دوں۔ کم سے کم ان سے پوچھ تو لینا چاہیے۔''

جالپا نے ہار اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور بولی۔ ''میں کسی سے کچھ نہیں پوچھنا چاہتی۔ میری مرضی ہے لوں یا واپس کر دوں۔ کسی سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟''

اس نے ہار کو اسی ڈبیا میں رکھ دیا اور اس پر کپڑا لپیٹ کر سینے لگی۔ رما نے ایک بار پھر ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''ایسی جلدی کیا ہے؟ دس پانچ دن میں لوٹا دینا۔ ان لوگوں کی بھی خاطر ہو جائے گی۔''

جالپا نے بے رخی کے ساتھ کہا۔ ''جب تک میں اسے لوٹا نہ دوں گی، مجھے چین نہ آئے گا۔''

ایک لمحہ میں پارسل تیار ہو گیا اور رما اسے لیکر ایک متفکرانہ انداز سے نیچے اترا۔ گھڑی میں چار بجے تھے۔

(11)

منشی دیا ناتھ کو جب رما کے نوکر ہونے کی خبر ملی تو بہت خوش ہوئے۔ شادی

ہوتے ہی وہ اتنی جلدی سنبھل جائے گا، اس کی انہیں امید نہ تھی۔ بولے جگہ تو اچھی ہے۔ ایمان داری سے کام کرو گے تو اچھی جگہ پر پہنچ جاؤ گے۔ میری یہی نصیحت ہے کہ پرائے پیسے کو حرام سمجھنا۔

رما کے جی میں آیا کہ صاف کہہ دے کہ آپ اپنی نصیحت اپنے لیے ہی رکھیں۔ یہ میرے موافق نہیں ہے۔ مگر اتنا بے حیا نہ تھا۔

دیاناتھ نے پھر پوچھا۔ ''یہ جگہ تو تیس روپے کی تھی۔ تمہیں بیس ہی کیوں ملے؟''

رما ناتھ نے بات بنائی۔ نئے آدمی کو پوری تنخواہ کیسے دیتے۔ شاید سال چھ مہینے میں ترقی ہو جائے۔

رما نے دوسرے دن نیا سوٹ بنوایا اور فیشن کی کتنی ہی چیزیں خریدیں۔

سسرال سے ملے ہوئے روپے کچھ بچ رہے تھے، کچھ دوستوں سے قرض لیے۔ وہ صاحبی ٹھاٹھ بنا کر سارے دفتر پر رعب جما دیتا تھا۔ اچھی آمدنی جبھی ہو سکتی ہے، جب اچھا ٹھاٹھ ہو۔ سڑک کے چوکیدار کو یکے والے ایک پیسہ دے کر ٹال دیتے ہیں، اس کی جگہ سارجنٹ ہو تو کسی کی ہمت بھی نہ پڑے گی کہ اسے ایک پیسہ دکھائے۔ پھٹے حال بھکاری کے لیے ایک چٹکی کافی ہے، لیکن گیروے ریشم پہنے ہوئے بابا جی کو شرماتے شرماتے بھی ایک روپیہ ہی دینا پڑتا ہے۔

تیسرے دن رما کوٹ پتلون پہن کر نکلا۔ تو اس کی شان ہی کچھ اور ہو گئی۔ چپڑاسیوں نے جھک جھک کر سلام کیے۔ رمیش بابو سے مل کر جب وہ اپنے کام کا چارج لینے آیا تو دیکھا ایک برآمدے میں پھٹی ہوئی میلی دری پر ایک میاں

صاحب صندوق پر رجسٹر پھیلائے بیٹھے تھے اور بیوپاری لوگ انہیں چاروں طرف سے گھیرے کھڑے ہیں۔ سامنے تھیلے اور گاڑیوں کے بازار لگے ہوئے ہیں۔ سبھی اپنے اپنے کام کی جلدی مچا رہے ہیں۔

سارا کام انتہا درجے کی بے قاعدگی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس پھٹی ہوئی دری پر بیٹھنا رما کو اپنی شان کے خلاف معلوم ہوا۔ وہ سیدھا رمیش کے پاس جا کر بولا۔

''کیا آپ مجھے بھی ایسی میلی دری پر بٹھانا چاہتے ہیں۔ ایک اچھی سی میز اور کئی کرسیاں بھجوا دیجیے۔'' رمیش بابو نے مسکرا کر میز اور کرسیاں بھجوا دیں۔ رما ناتھ شان سے کرسی پر بیٹھا۔ بوڑھے منشی جی اس کی رعونت پر دل میں ہنس رہے تھے۔ سمجھ گئے ابھی نیا جوش ہے، نئی امنگ ہے۔ چارج دے دیا۔ چارج میں تھا ہی کیا۔ صرف ایک رجسٹر اور آج کی آمدنی کا حساب محصول کے نرخ کا گوشوارہ موجود تھا۔ بوڑھے منشی جی نے اگرچہ خود استعفیٰ دیا تھا، پر اس وقت یہاں سے جاتے ہوئے رنج ہو رہا تھا۔ اس جگہ وہ تیس سال سے برابر چلے آ رہے تھے۔ اسی جگہ کی بدولت انہوں نے دولت اور نام دونوں ہی کمایا۔ اسے چھوڑتے ہوئے کیوں نہ رنج ہوتا۔ چارج دے کر جب وہ رخصت ہونے لگے تو رما ناتھ زینے کے نیچے تک گیا، خان صاحب اس کے اخلاق سے خوش ہو گئے اور بولے، ہر ایک بلٹی پر ایک آنہ بندھا ہوا۔ کھلا ہوا راز ہے۔ لوگ شوق سے دیتے ہیں۔ آپ کو خدا نے توفیق دی ہے، مگر رسم نہ بگاڑیئے۔ ایک بار کوئی رسم ٹوٹ جاتی ہے تو اس کا بندھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک ایک آنہ میں آدھا چپڑاسیوں کا حق ہے۔ آدھا آپ کا۔ جو بڑے بابو پہلے تھے، وہ پچیس روپے ماہوار لیتے تھے۔ مگر یہ تو بالکل بے لوث

ہیں۔''

رما نے بے دلی کے ساتھ کہا۔ ''مجھے تو یہ گندہ معلوم ہوتا ہے۔ میں صفائی کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں۔''

بوڑھے میاں نے ہنس کر کہا۔ ''ابھی گندہ معلوم ہوتا ہے، لیکن پھر اسی میں لطف آئے گا۔''

خان صاحب کو رخصت کر کے رما اپنی کرسی پر آ بیٹھا اور ایک چپڑاسی سے بولا۔ ''ان لوگوں سے کہو کہ برآمدے کے نیچے چلے جائیں اور ایک ایک کر کے نمبر وار آویں۔ ایک کاغذ پر سب کا نام نمبر وار لکھ لیا کرو۔ جو پہلے آئے اس کا کام پہلے ہونا چاہیے۔ مجھے یہ لپڑ دھوں دھوں پسند نہیں کہ سب سے پیچھے والے شور مچا کر پہلے آ جائیں اور پہلے والے کھڑے منہ تاکتے رہیں۔''

کئی بیوپاریوں نے کہا۔ ''ہاں بابو جی، یہ انتظام ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔''

یہ حکم رما کا رعب جمانے کے لیے کافی تھا۔ روزگاڑیوں کے حلقے میں آج ہی اس باقاعدگی اور ضابطے کی تعریف ہونے لگی ہے۔ کسی بڑے کالج کے پروفیسر کو اتنی شہرت عمر بھر میں نہ ملتی۔

دو چار دن کے تجربے سے رما کو سارے داؤ گھات معلوم ہو گئے۔ ایسی ایسی گھاتیں سوجھتی گئیں، جو خان صاحب کو خواب میں بھی نہ سوجھی تھیں۔ مال کے وزن، شمار اور تشخیص میں اتنی دھاندلی تھی، جس کی کوئی حد نہیں۔ جب اس دھاندلی سے بیوپاریوں کو سینکڑوں کی بچت ہو جاتی ہے تو رما بلٹی پر ایک ایک آنہ لے کر کیوں قناعت کرے۔ ذرا سختی کا برتاؤ کر کے وہ دولت اور نیک نامی دونوں ہی

حاصل کر سکتا ہے، پھر وہ اس سنہری موقع کو کیوں چھوڑ دے۔

رما کی آمدنی تیزی سے بڑھنے لگی۔ آمدنی کے ساتھ وقار بھی بڑھا کہ سوکھی قلم گھسنے والے دفتر کے بابوؤں کو جب سگریٹ، پان، چائے یا چاٹ کی خواہش ہوتی تو رما کے پاس چلے آتے۔ بہتی گنگا تھی، جس میں سبھی ہاتھ دھو سکتے تھے۔ سارے دفتر میں رما کی تعریف ہونے لگی۔ پیسے کو تو وہ کچھ سمجھتا ہی نہیں، کیا دل ہے کہ واہ! اور جیسا دل ہے ویسی زبان بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے رگ رگ میں شرافت بھری ہوئی ہے۔ بابوؤں کا جب یہ حال تھا تو چپڑاسیوں اور چوکیداروں کا کیا پوچھنا؟ سب کے سب رما کے بن داموں غلام تھے، ان غریبوں کا وقار بھی بڑھا، جہاں گاڑی بان تک پھٹکار دیا کرتے تھے، وہاں اب اچھے اچھوں کی گردن پکڑ کر نیچے دھکیل دیتے تھے، رما ناتھ کا سکہ بیٹھ گیا۔

مگر جالپا کی آرزوؤں میں سے ابھی ایک بھی پوری نہ ہوئی۔ ناگ پنچمی کے دن محلے کی کئی لڑکیاں جالپا کے ساتھ کھیلنے آئیں۔ مگر جالپا اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ بھادوں میں جنم اشٹمی کی تقریب آئی۔ پڑوس ہی میں ایک سیٹھ جی رہتے تھے۔ ان کے یہاں بڑے دھوم دھام سے جشن منایا جاتا تھا۔ وہاں سے ساس اور بہو کا بلاوا آیا۔ جا گیشری گئی، جالپا نے جانے سے انکار کر دیا۔ ان تین مہینوں میں اس نے رما سے ایک بار بھی زیوروں کا چرچا نہ کیا۔ اس گوشۂ تنہائی میں وہ اس فہرست کو دیکھا کرتی، جو رما ایک دن کہیں سے اٹھا لایا تھا۔ اس میں طرح طرح کے نفیس زیوروں کے نمونے بنے ہوئے تھے، رما کو دیکھتے ہی وہ فہرست چھپا لیتی تھی۔ اپنی گرویدگی کا پردہ ڈھکا رکھنا چاہتی تھی۔

رما آدھی رات کے بعد لوٹا تو دیکھا جالپا کمرے کے دروازے پر کھڑی ہے۔ ہمدردانہ انداز سے بولا۔ ''تم گئی کیوں نہیں؟ لوگ انتظار کر رہے تھے۔ بڑا اچھا گانا ہو رہا تھا۔''

جالپا نے بے اعتنائی سے کہا۔ ''تم تو سن آئے۔ میں نہ گئی تو کیا ہوا۔ وہاں جاتی تو کس کے منہ میں کالک لگتی؟''

رما شرمندہ ہو کر بولا۔ ''کالک لگنے کی کوئی بات نہ تھی۔ سبھی جانتے ہیں کہ چوری ہو گئی ہے اور اس زمانے میں دو چار ہزار روپے کی چیزیں ہنوالینا منہ کا نوالہ نہیں ہے۔''

چوری کا لفظ زبان پر لاتے ہی رما کا کلیجہ دھڑک اٹھا۔ جالپا شوہر کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر رہ گئی۔ بولنے سے بات بڑھ جانے کا اندیشہ تھا، لیکن رما کو اس کی نگاہ سے ایسا مترشح ہوا گویا اسے چوری کا راز معلوم ہے اور محض حجاب کے باعث اسے زبان پر نہیں لاتی۔ انہیں اس خواب کی بھی یاد آئی، جو جالپا نے اس رات کو دیکھا تھا۔ وہ نگاہ تیر کی طرح اس کے دل میں چبھنے لگی۔ اسے پھر خیال آیا، شاید مجھے دھوکا ہوا۔ اس کی نگاہ میں غصہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے، مگر یہ چپ کیوں ہے؟ بولتی کیوں نہیں؟ اس کی خاموشی غضب تھی۔ اپنا شبہ رفع کرنے اور جالپا کے دل کی تھاہ لینے کے لیے گویا اس نے ڈبکی ماری۔ یہ کون جانتا تھا کہ اس کے گھر میں قدم رکھتے ہی یہ مصیبت تمہاری پیشوائی کرے گی۔

جالپا آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ ''تو میں تم سے زیوروں کا تقاضا نہیں کرتی۔ تقدیر کے نوشتے کو انسان ٹال سکتا ہے تو رونا ہی کس بات کا تھا۔ جن عورتوں کو

زیور میسر نہیں ہوتے، کیا ان کے دن نہیں کٹتے؟''

اس جواب نے رما کا شبہ تو رفع کر دیا تھا، مگر اس میں جو نالۂ درد چھپا ہوا تھا، اس سے چھپا نہ رہا۔ ان تین مہینوں میں بہت احتیاط کرنے پر بھی وہ سو روپیہ سے زیادہ جمع نہ کر سکا تھا۔ بابوؤں کی خاطر اور تواضع میں اسے بہت بل کھانا پڑتا تھا، مگر بغیر کھلائے پلائے کام بھی تو نہ چل سکتا تھا۔ سبھی اس کے دشمن ہو جاتے اور اسے اکھاڑنے کی گھاتیں سوچنے لگتے۔ مفت کی دولت تنہا ہضم نہیں ہوتی۔ یہ وہ خوب جانتا تھا۔ ہاں وہ خود ایک پیسہ بھی فضول خرچ نہ کرتا۔ ہوشیار بیوپاری کی طرح وہ کچھ خرچ کرتا تھا، وہ صرف کمانے کے لیے۔ اسے تسلی دے کر بولا۔ ''ایشور نے چاہا تو ایک آدھ چیز بن ہی جائے گی۔''

جالپا نے صابرانہ انداز سے کہا۔ ''میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں، جو زیوروں پر جان دیتی ہوں۔ اسی طرح کسی کے گھر آتے جاتے شرم آتی ہی ہے۔''

جالپا کے ایک ایک لفظ سے حسرت اور مایوسی ٹپک رہی تھی۔ اس کی روحانی خلش کا باعث کون تھا۔ جالپا نے اگر لحاظ کے مارے زیوروں کا ذکر نہ کیا تو رما اس کے آنسو پونچھنے کی اس دلجوئی کرنے کے لیے کیا خاموشی کے بجائے کوئی تدبیر نہ کی تھی۔ محلے میں روز ہی ایک نہ ایک تقریب آتی رہتی ہے، روز ہی پاس پڑوس کی عورتیں ملنے آتی ہیں۔ بیچاری جالپا کب تک اس طرح اپنے دل پر جبر کرتی رہے گی، ہنسنے بولنے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔ کون قیدیوں کی طرح اکیلے پڑا رہنا پسند کرتا ہے۔

اس نے سوچا کہ کسی تدبیر سے زیور ادھار نہیں لیے جا سکتے۔ کئی بڑے بڑے صرافوں سے اس کا دوستانہ ہو گیا تھا، لیکن مشکل یہی تھی کہ ان سے کہے کون۔ ممکن ہے کہ وہ انکار ہی کر دیں یا کوئی وعدے پر روپے نہ ادا ہوئے تو شرمندہ ہونا پڑے گا۔ ابھی کچھ دن اور صبر کرنا چاہیے۔

دفعتاً اسے خیال آیا دیکھوں اس معاملے میں جالپا کی کیا رائے ہے۔ اگر جالپا کو خواہش ہو تو وہ کسی صراف سے سلسلۂ جنبانی کرے گا اور ذلت اور شرمندگی کو خوشی سے برداشت کرے گا۔ بولا۔ ''تم سے ایک صلاح کرنا چاہتا ہوں۔''

جالپا کو نیند آ رہی تھی۔ آنکھیں بند کیے ہوئے بولی۔ ''اب سونے دو بھئی سویرے اٹھنا ہے۔''

رما نے پوچھا۔ ''اگر تمہاری رائے ہو تو کسی صراف سے وعدے پر چیزیں بنوا لاؤں۔ اس میں تو کوئی ہرج نہیں ہے۔''

جالپا کی آنکھیں کھل گئیں۔ کتنا بے رحمانہ سوال تھا۔ کسی مہمان سے پوچھنا کہ کہیے تو آپ کے لیے کھانا لاؤ۔ اس کا تو یہی مطلب ہے کہ ہم مہمان کو کھلانا نہیں چاہتے۔ رما کو لازم تھا کہ چیزیں لا کر جالپا کے سامنے رکھ دیتا۔ اس کے بار بار پوچھنے پر ہی اسے یہی کہنا چاہیے تھا کہ نقد لایا ہوں۔ تب وہ البتہ خوش ہوتی۔ اس معاملے میں اس کی صلاح لینا اس کے زخم پر نمک چھڑکنا تھا۔ جالپا نے رما کی طرف ناہمدردانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''میں تو زیوروں کے لیے اتنی بے قرار نہیں ہوں۔''

رما نے کہا۔ ''نہیں یہ بات نہیں۔ آخر اس میں کیا ہرج ہے کہ کسی صراف سے

سودا کرلیا جائے۔ روپے رفتہ رفتہ چکا دیئے جائیں گے۔''

جالپا نے بغیر کسی توقف کے جواب دیا۔ ''نہیں میرے لیے قرض لینے کی ضرورت نہیں۔ میں بیسوا نہیں ہوں کہ تمہیں نوچ کھسوٹ کر اپنا راستہ لوں۔ مجھے تمہارے ساتھ جینا اور مرنا ہے۔ اگر مجھے ساری عمر زیوروں کے بغیر رہنا پڑے، تو بھی میں قرض لینے کو نہ کہوں گی۔ عورتوں کو گہنوں کی اتنی ہوس نہیں ہوتی، گھر کے آدمیوں کو مصیبت میں ڈال کر زیور پہننے والیاں دوسری ہوں گی، لیکن تم نے تو پہلے کہا تھا جگہ بڑی آمدنی کی ہے، مجھے تو کوئی خاص بچت دکھائی نہیں دیتی۔''

رما نے صفائی دی۔ ''بچت تو ضرور ہوتی اور اچھی ہوتی، لیکن جب اہلکاروں کے مارے بچنے بھی پائے۔ سب کے سب شیطان کی طرح سر پر سوار رہتے ہیں۔''

''تو ابھی کون سی جلدی ہے۔ بنتے رہیں گے آہستہ آہستہ!''

''خیر تمہاری صلاح ہے تو ابھی خاموش رہتا ہوں۔ میں سے پہلے کنگن بنواؤں گا۔''

''تمہارے پاس ابھی اتنے روپے کہاں ہوں گے۔''

''اس کی فکر میں کرلوں گا، تمہیں کیسا کنگن پسند ہے؟''

جالپا اپنے مصنوعی استغنا کو نہ نبھا سکی۔ الماری میں سے زیوروں کی فہرست نکال کر رما کو دکھانے لگی۔ اس وقت وہ اتنی سرگرم تھی گویا سونا آ کر رکھا ہوا ہے۔ سنار بیٹھا ہوا ہے، صرف وضع کا پسند کرنا باقی ہے۔ اس نے فہرست کے دو ڈیزائن پسند کیے اور دونوں نہایت خوشنما، مگر رما ان کی قیمت دیکھ کر سکتے میں آ گیا۔ ایک

ایک ہزار کا تھا، دوسرا آٹھ سو کا۔

رما نے ٹال کر کہا۔ ''ایسی چیزیں تو یہاں بن بھی نہ سکیں۔ مگر کل میں ذرا صرافے کی سیر کروں گا۔''

جالپا نے فہرست کو بند کر کے حسرتناک لہجہ میں کہا۔ ''تمہارے پاس نہ جانے کبھی روپے ہوں گے یا نہیں اونہہ، بنیں گے نہیں۔ کون کوئی گہنے کے بغیر مرا جاتا ہے۔''

رما ناتھ کو آج اس ادھیڑ بن میں بڑی دیر تک نیند نہ آئی۔ یہ جڑاؤ کنگن اس کی گوری گوری کلائیوں پر کتنے بھلے معلوم ہوں گے۔ یہ دل آویز خواب دیکھتے دیکھتے نہ جانے کب نیند آ گئی۔

(12)

دوسرے دن سویرے ہی رما نے رمیش بابو کے گھر کا راستہ لیا۔ ان کے یہاں جنم اشٹمی کی جھانکی ہوتی تھی۔ انہیں خود تو اس سے کوئی شوق نہ تھا، مگر ان کی بیوی یہ جشن مناتی تھی۔ اس کی یادگار میں وہ اب تک رسم ادا کرتے جاتے تھے۔ رما کو دیکھ کر بولے۔ ''آؤ جی رات کیوں نہیں آئے۔ مگر یہاں غریبوں کے گھر کیوں آتے۔ سیٹھ جی کے یہاں تو خوب بہار ہوگی۔''

رما: ''ایسی سجاوٹ تو نہ تھی۔ ہاں گانے کا انتظام اچھا تھا۔ کئی کتھک اور کئی طوائفیں بھی تھیں۔''

رمیش: ''سیٹھ جی نے تو وعدی کیا تھا کہ طوائفیں نہ آنے پائیں گی، مگر اس کی پروا نہ کی۔ ایک تو طوائفوں کا ناچ یوں ہی برا۔ اس پر ٹھاکر دوارے میں نہ جانے

ان گدھوں کو کب عقل آئے گی۔''

رما: ''طوائفیں نہ ہوں تو جھانکی کو دیکھنے جائے ہی کون۔ سبھی تو آپ کی طرح زاہد نہیں ہیں۔''

رمیش: ''خیر فرصت ہو تو آؤ ایک آدھ بازی ہو جائے؟''

رما: ''اور آیا کس لیے ہوں۔ مگر آج آپ کو میرے ساتھ صرافے تک چلنا پڑے گا۔''

رمیش: ''چلنے کو چلا چلوں گا۔ مگر اس معاملے میں میں بالکل کورا ہوں۔ نہ کوئی چیز بنوائی، نہ خریدی۔ تمہیں کچھ لینا ہے؟''

رما: ''لینا دینا کیا ہے، ذرا بھاؤ تاؤ دیکھنا ہے؟''

رمیش: ''معلوم ہوتا ہے گھر میں پھٹکار پڑی ہے؟''

رما: ''وہ تو زیوروں کا نام تک نہیں لیتی۔ لیکن اپنا فرض تو کچھ ہے؟''

رمیش: ''شاید کچھ روپے جمع کر لیے۔''

رما: ''روپے کس کے پاس ہیں، وعدے پر لوں گا۔''

رمیش: ''بھائی اس خبط میں نہ پڑو۔ جب تک روپے ہاتھ میں نہ ہوں۔ بازار کی طرف جاؤ ہی مت۔ زیوروں سے تو بڈھے نئی بیبیوں کا دل خوش کرتے ہیں۔ جوانوں کے لیے بہت سے لٹکے ہیں۔''

رما: ''میں دو تین مہینے میں سب روپے ادا کر دوں گا۔ اگر اس کا یقین نہ ہوتا تو میں ذکر ہی نہ کرتا۔''

رمیش: ''تو دو تین مہینے اور کیوں صبر نہیں کر جاتے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ تمہاری

آمدنی اچھی ہے، لیکن آئندہ کے بھروسے پر اور جو کام چاہے کرو، قرض کبھی مت لو۔ زیوروں کا قرض اس غریب ملک میں نہ جانے کیسے پھیل گیا۔ جنہیں روٹیوں کا بھی ٹھکانا نہیں۔ وہ بھی زیوروں کے پیچھے جان دیتے ہیں۔ ہر سال اربوں روپے سونا چاندی خریدنے میں صرف ہو جاتے ہیں۔ دنیا کے اور کسی ملک میں زیوروں کا اتنا رواج نہیں۔ ترقی یافتہ ملکوں میں دولت تجارت میں صرف ہوتی ہے، جس سے لوگوں کی پرورش ہوتی ہے اور دولت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہاں دولت آرائش میں خرچ ہوتی ہے۔ بس یہی سمجھ لو کہ جس ملک میں جتنی ہی زیادہ جہالت پیدا ہوتی ہے، اتنا ہی زیوروں کا رواج ہوتا ہے۔ یہاں تو خیر ناک کان چھدا کر ہی رہ جاتے ہیں، مگر بعض ایسے ملک بھی ہیں، جہاں ہونٹ چھدوائے جاتے ہیں اور اس میں زیور پہنتے ہیں۔''

رما: ''وہ کون سا ملک ہے۔''

رمیش: ''اس وقت تو ٹھیک یاد نہیں آتا شاید افریقہ ہوا۔ تمہیں یہ سن کر تعجب ہوتا ہے، لیکن دوسرے ملک والوں کے لیے ناک کان چھیدنا کچھ کم تعجب کی بات نہ ہوگی۔ برا مرض ہے اور وہ دولت، جو کھانے پینے میں صرف ہونی چاہیے، بال بچوں کا پیٹ کاٹ کر زیوروں کی نذر کر دی جاتی ہے۔ بچوں کو دودھ نہ ملے نہ سہی، گھی کی بوتک ان کی ناک میں نہ پہنچے نہ سہی۔ میووں اور پھلوں کے درشن انہیں نہ ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر بیوی گہنے ضرور پہنے گی اور میاں گہنے ضرور بنوائیں گے۔''

رما: ''میں تو سمجھتا ہوں ایسا کوئی بھی ملک نہیں، جہاں عورتیں زیور نہ پہنتی

ہوں۔''

رمیش بابو اس بحث میں شطرنج بھول گئے۔ چھٹی کا دن تھا ہی، دو چار ملنے والے اور آ گئے، رما چپکے سے کھسک آیا۔ اس بحث میں ایک بات ایسی تھی، جو اس کے دل میں بیٹھ گئی۔ اب وہ قرض سے گھنے نہ لے گا۔ صرافے تک گیا ضرور مگر کسی دکان پر جانے کی ہمت نہ پڑی۔

وہ گھر پہنچا تو نو بج گئے تھے۔ دیاناتھ نے اس کو دیکھا تو پوچھا۔ ''آج سویرے کہاں چلے گئے تھے؟''

رما: ''ذرا بڑے بابو سے ملنے گیا تھا۔''

دیاناتھ: ''گھنٹے آدھ گھنٹے کے لیے کتب خانے کیوں نہیں چلے جایا کرتے۔ ابھی تمہارے پڑھنے لکھنے کی عمر ہے۔ امتحان نہ سہی اپنی لیاقت تو بڑھا سکتے ہو۔ ایک سیدھا سا خط لکھنا پڑ جاتا ہے تو بغلیں جھانکنے لگتے ہو۔ اصلی تعلیم مدرسہ چھوڑنے کے بعد ہی شروع ہوتی ہے اور وہی زندگی میں ہمارے کام آتی ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں کچھ ایسی باتیں سنی ہیں، جن سے مجھے رنج ہوا اور تمہیں وہ سمجھا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ میرے گھر میں حرام کی ایک کوڑی بھی آئے۔''

رما نے مصنوعی غصہ دکھا کر کہا۔ ''آپ سے کس نے یہ بات کہی۔ میں اس کی مونچھیں اکھاڑ لوں گا۔''

دیاناتھ: ''کسی نے بھی کہی ہو۔ اس سے تمہیں کوئی مطلب نہیں، لیکن بات سچ ہے یا جھوٹ۔ میں اتنا ہی پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''بالکل جھوٹ۔''

''بالکل جھوٹ؟''

''جی ہاں بالکل جھوٹ۔''

''تم دستوری نہیں لیتے؟''

''دستوری رشوت نہیں ہے۔ سبھی لیتے ہیں اور اعلانیہ لیتے ہیں۔ لوگ بغیر مانگے دیتے ہیں۔ میں کسی سے مانگنے نہیں جاتا۔''

''سبھی اعلانیہ لیتے ہیں اور لوگ بغیر مانگے دیتے ہیں۔ اس سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رشوت اچھی چیز ہے۔''

''دستوری بند کر دینا میرے قابو کی بات نہیں۔ میں خود نہ لوں، مگر چپڑاسی اور محرر کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ آٹھ آٹھ نو نو روپے پانے والے نوکر اگر نہ لیں تو ان کا کام ہی نہیں چل سکتا۔''

دیاناتھ: ''میں نے تمہیں سمجھا دیا۔ ماننے نہ ماننے کا تمہیں اختیار ہے۔''

یہ کہتے ہوئے دیاناتھ دفتر چلے گئے۔ رما کے جی میں، آیا صاف کہہ دے۔ آپ نے بے لوث بن کر زندگی میں کیا کر لیا کہ مجھے تعلیم دے رہے ہیں۔ ہمیشہ پیسے پیسے کو محتاج رہے۔ لڑکوں کو پڑھا تک نہیں سکے۔ یہ دیانتداری اس وقت اچھی معلوم ہوتی ہے جبکہ نیت بھی صاف رہتی اور زندگی بھی آرام سے گزرتی۔

رما گھر میں گیا تو ماں نے پوچھا۔ ''تمہارے بابو جی کس بات پر بگڑ رہے تھے؟''

رما: ''مجھے تعلیم دے رہے تھے کہ دستوری مت لیا کرو۔''

جاگیشری: ''تم نے کہا نہیں۔ آپ نے بڑی ایمانداری کی تو کون سے جھنڈے گاڑ دیئے، ساری زندگی پیٹ پالتے رہے۔''

رما: ''کہنا تو چاہتا تھا، مگر چڑ جاتے۔ آپ کو لینے کا شعور تو ہے نہیں، جب دیکھا کہ یہاں دال نہیں گلتی تو بھگت بن گئے۔ بیوپاریوں سے روپے نکالنے کے لیے عقل چاہیے، جہاں کسی نے بھگت پن کیا اور میں سمجھ گیا کہ بدھو ہے لینے کی تمیز نہیں۔ کیا کرے۔ بیچارہ کسی طرح آنسو تو پونچھتے۔''

جاگیشری: ''بس بس یہی بات ہے بیٹا جسے لینا آئے گا، وہ ضرور دے گا۔ انہیں تو بس گھر میں قانون بگھارنا آتا ہے۔''

رما دفتر جاتے وقت اوپر کپڑے پہننے گیا تو جالپا نے اسے تین لفافے ڈاک میں چھوڑنے کے لیے دیئے۔ اس وقت اس نے تینوں لفافے جیب میں ڈال لیے، لیکن راستے میں انہیں کھول کر چٹھیاں پڑھنے لگا۔ خط کیا تھے؟ مصیبت اور درد کی داستان تھی، جو اس نے اپنی سہیلیوں کو سنائی تھی۔

رما نے تینوں چٹھیاں جیب میں رکھ لیں۔ ڈاکخانے کے سامنے سے گزر گیا، پر اس نے انہیں چھوڑا نہیں۔ جالپا ابھی تک یہی سمجھتی ہے کہ میں اسے دھوکا دے رہا ہوں۔ اسے کیسے یقین دلاؤں۔ اگر اپنا بس ہوتا تو اسی وقت زیوروں کے ٹوکرے بھر بھر کر جالپا کے سامنے رکھ دیتا۔ یا اسے کسی بڑے صراف کی دکان پر لے جا کر کہتا۔ تمہیں جو جو چیزیں لینی ہوں لے لو۔ رما کو آج اس درد کا صحیح اندازہ ہوا، جو جالپا کے دل کو بے چین کر رہا تھا۔ ایسی حالت میں رما کو وعدے پر زیور لانے میں تامل کرنے کی مطلق گنجائش نہ تھی۔